قسط:۱۸

# ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

## تحریکِ ختمِ نبوت کا ایک یادگار جلسہ:

چنیوٹ سے لائل پور (فیصل آباد) آ کر میں نے جماعتِ احرار کی مقامی مجلس سے اپنا تعلق استوار رکھا، احرار کی ہر نوع کی سرگرمی میں شامل رہا اور جماعتی جلوس اور جلسوں میں باقاعدہ باوردی شمولیت جو کہ میری فطرت بن چکی تھی اسے برقرار رکھا۔ تحریک تحفظِ ختمِ نبوت کے ابتدائی دنوں میں مجلس احرار لاہور کی طرف سے بیرون دہلی دروازے کے باغ میں جلسہ تھا۔ پنجاب کے مختلف شہروں سے ہزاروں کی تعداد میں احرار کے باوردی رضا کاروں نے اس جلسے میں شمولیت کی اور میں بھی لائل پور کے جیش میں ایک رضا کار کی حیثیت میں لاہور کے اس جلسہ میں شریک ہوا۔ سب سے اہم تقریر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ تقریر اپنے جوبن پہ تھی۔ ردِّ قادیانیت موضوع تھا اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہی تھی کہ اچانک مولانا ظفر علی خان مرحوم سٹیج کے پیچھے سے دو آدمیوں کے سہارے تشریف لائے۔ امیر شریعت نے مولانا کا اپنے مخصوص انداز میں استقبال کیا، اُن کے دونوں رخساروں کو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں کیا اور کہا کہ ''ظفر علی تمہارے ''ستارۂ صبح'' نے میں قلب وجگر میں آگ لگا دی تھی۔''

میں اپنی زندگی میں پہلی دفعہ مولانا ظفر علی خان کو دیکھا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ میں اس وقت اتفاقاً سٹیج کے بالکل قریب کھڑا تھا، اُن پر رعشہ طاری تھا اور اُن کا سارا جسم کانپ رہا تھا یہی وجہ تھی کہ اُنہیں دو آدمیوں کے سہارے کی ضرورت تھی جو اُنہیں سٹیج تک لے آئے تھے۔ اس جلسہ میں امیر شریعت نے ردِّ قادیانیت کے بارے میں جو کچھ کہا وہ تو اس وقت مجھے یاد نہیں ہے۔ یہ جلسہ قادیانیوں کی ضمنی انتخابات میں بری طرح شکست کے موضوع پر اظہارِ تشکّر کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ الیکشن میں کھڑے ہونے والے قادیانی امیدواران اپنے ہر حلقے سے مسلم لیگ کی حمایت کے باوجود احرار کی مخالفت کی وجہ سے شکست سے دوچار ہوئے تھے، زیادہ تر یہی بات آپ کی تقریر کا موضوع رہی ہوگی۔ بہرحال ایک تاریخی فقرہ بھی امیر شریعتؒ نے اس تقریر میں ارشاد فرمایا تھا جو مجھے مرتے دم تک یاد رہے گا۔ وہ فقرہ یہ تھا:

''کہ میں تو پہلے ہی باز آنے والا نہیں تھا اور اب تو مجھے میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام آ رہے ہیں۔ کہ بیٹا اس

محاذ (یعنی ردِّ قادیانیت کے محاذ) پر ڈٹے رہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

جب آپ نے اپنی تقریر میں یہ فقرہ کہا تو پھر مجمع پر جو کیفیت طاری ہوئی اُسے میں بیان کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ مجمع یک دم پُر جوش انداز میں کھڑا ہو گیا اور امیر شریعت زندہ باد، مجلس احرارِ اسلام زندہ باد کے نعروں سے پوری فضا کو مسحور ہو گئی۔ جلسہ تو ختم ہو گیا لیکن نہ جانے کیوں میں اس فقرے کے بارے میں فکر مند ہوا کہ آپ نے یہ بات کیسے کہی۔ کیا خود امیر شریعت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی سعادت حاصل ہوئی یا پھر اور کس طرح یہ پیغامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم امیر شریعت تک پہنچا۔ چنانچہ ادھر اُدھر میں نے جب اس سلسلے میں اپنے سے بڑے اور امیر شریعت کے قریبی ساتھیوں سے پوچھنا شروع کیا جن میں مولانا عبید اللہ احرار صدر مجلس احرارِ اسلام لائل پور بھی شامل تھے تو مجھے یہ بتایا گیا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور اُنہیں خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

''میرے بیٹے عطاء اللہ کو میری طرف سے سلام کہنا اور اُسے تاکید کرنا کہ ردّ قادیانیت کے محاذ پر ڈٹا رہے میں اُس کے ساتھ کھڑا ہوں۔''

میں کیوں نہ رشک اُس کے نصیب پر کروں
آئے پیام جس کو رسالت مآب کا

## کالج میں داخلہ کا مسئلہ:

طارق آباد سکول میں تین برس تک میں چونکہ باقاعدہ ہاکی کھیلتا رہا اور میرا یہ شوق اپنے عروج پر رہا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ شہر کے دونوں کالج گورنمنٹ کالج اور زرعی کالج (جو اس وقت تک کالج ہی تھا یونیورسٹی نہیں بنا تھا) کے سینئر ہاکی کھلاڑی مجھے اور میرے دوست بشیر کے پاس آ کر اپنے اپنے کالج میں داخلہ لینے کے لیے بار بار کہتے تھے۔ دونوں طرف سے ہمیں ''فری'' داخلہ اور فل فیس رعایت کی پیشکش کی گئی۔ زرعی کالج والوں نے تو اپنے ہاسٹل میں کمرے کی بھی ''آفر'' اور خوراک ورہائش تک مفت کر دینے کا بھی وعدہ کیا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں آزمائش میں پڑ گئے اور اکثر ایک دوسرے سے مل کر سوچتے کہ کس کالج میں داخل ہوں۔ بہر حال ایک فیصلہ ہم دونوں نے مشترکہ طور پر یہ ضرور کر لیا تھا کہ جس کالج میں بھی داخل ہوں اکٹھے ہی ہوں گے۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہوا کہ بشیر تو زرعی کالج میں داخل ہو گیا اور میں گورنمنٹ کالج داخل ہو گیا دونوں اس سے بے خبر ہی رہے یا پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بشیر اکیلا زرعی کالج والوں کے قابو آ گیا اور میں گورنمنٹ کالج والوں کے، بہر حال ہم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اور یہ دونوں کالج ایسے کالج تھے جن کی ہاکی کے حوالے سے خصوصاً آپس میں خاصی رقابت تھی۔ ان کے درمیان

جب کبھی یونیورسٹی میچ ہوتا تھا پورا شہر دیکھنے کے لیے آجاتا تھا۔ اور نعرے بازی سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ نعرے بھی کچھ ایسے مزیدار ہوتے کہ غیر جانب دار لوگ بھی اُن نعروں سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ مثلاً زرعی کالج والے گورنمنٹ کالج کے خلاف جو نعرے عموماً لگاتے وہ کچھ ایسے ہوتے ''سُرخی پوڈر۔ ہائے ہائے۔ کنگھی شیشہ ہائے ہائے'' اس کے جواب میں جو نعرے گورنمنٹ کالج کے حامی زرعی کالج کی ٹیم کے خلاف لگاتے تھے وہ کچھ اس طرح کے ہوتے تھے ''ہل پنجالی ہائے ہائے، گاجر مولی ہائے ہائے''۔ ہم سکول کے زمانہ میں یہ میچ دیکھنے ضرور جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان دونوں کالجوں کے سینئر کھلاڑی ہمارے واقف تھے۔ زرعی کالج کے سینئر کھلاڑی چودھری غلام رسول اور اولمپئین کھلاڑی جو بعد میں اس پاکستان ہاکی ٹیم کے نائب کپتان تھے جب ۱۹۶۰ میں پاکستان روم اولمپک میں پہلی دفعہ بھارت کو شکست دے کر چیمپئین بنا تھا۔ اور گورنمنٹ کالج کے سینئر کھلاڑی غلام سرور اعوان تھے۔ جو بعد میں کراچی میں پنجابی گروپ کے لیڈر بن کے ابھرے۔ جبکہ سندھی، بلوچی، پٹھان گروپوں نے وہاں ایک منظّم صورت اختیار کر لی تھی۔ اور ایک مدت تک سرور اعوان کے چرچے اخباروں کی زینت بنے رہے۔

مجھے بشیر سے جدا ہونے کا افسوس تھا لیکن اب جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ میں گرمی کی چھٹیوں سے پہلے تک گورنمنٹ کالج کی ہاکی ٹیم کا رکن رہا اور اس دوران جتنے بھی میچ ہوئے ان میں میں نے گورنمنٹ کالج کی ہاکی ٹیم کے ایک رکن کی حیثیت سے شمولیت کی۔ اور یہی بات بشیر کی بھی تھی کہ وہ زرعی کالج کی ہاکی ٹیم کا رکن تھا۔ بہرحال ہم آپس میں ملتے تو اس پر اپنے آپ کا مذاق اڑاتے گورنمنٹ کالج سے زرعی کالج، لیکن جب گرمی کی چھٹیاں ہوئیں تو پھر چودھری غلام رسول مرحوم نے دوبارہ مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے اپنے کالج ''مائی گریشن'' کے لیے کہنا شروع کر دیا۔ یہ باقاعدہ مہم تھی جو انہوں نے مجھے اپنے کالج لے جانے کے لیے شروع کر دی تھی۔ ابتدا میں تو میں انکار ہی کرتا رہا لیکن بالآخر وہ مجھے اپنے کالج لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور گرمی کی چھٹیوں کے بعد میں گورنمنٹ کالج کے طالب علم کی بجائے زرعی کالج کا طالب علم تھا۔ میرے اس فیصلے پر گورنمنٹ کالج کے کھلاڑی مجھ سے ناراض ہو گئے اور خاص طور پر گورنمنٹ کالج ہاکی ٹیم کے انچارج اور کوچ چوہدری غلام رسول وڑائچ جو کہ گورنمنٹ کالج کے ڈی۔ پی۔ ای بھی تھے اور کھلاڑیوں میں اپنی بڑی اہم خصوصیات کی بنا پر بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے وہ تو بہت ہی ناراض ہو گئے اور اُنہوں نے کہا شبیر نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔ بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا اور میں پھر سے اپنے اسکول کے ساتھی بشیر کے ساتھ زرعی کالج میں جا ملا۔ اور ہم دونوں نے اپنی تعلیم اور ہاکی کا سلسلہ شروع کر دیا۔

## زرعی کالج کا ماحول:

زرعی کالج میں پہلا دن فرسٹ ائیر فول کے شور شرابے میں گزر گیا۔ میں زرعی کالج میں سرے سے اجنبی تھا۔ صرف چند ہاکی کے کھلاڑی ہی میرے شناسا تھے۔ جبکہ گورنمنٹ کالج میں، میں نے اپنا ایک خاص گروپ بنا لیا تھا۔ جس میں بڑے اچھے چند دوست جن کے ساتھ میری دوستی بعد میں بھی برقرار رہی میرے ساتھی تھے پہلے دن ہی زرعی کالج میں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ

یہاں کا ماحول مجھے راس نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس کالج میں شہر کے لڑکے باہر کے لڑکوں سے بہت کم تھے۔ پورے ملک سے طالب علم یہاں اس کالج میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ جس سے ماحول میں وہ اپنائیت مفقود تھی جو گورنمنٹ کالج کے در و دیوار سے میرے اُنس کا سبب تھی اور پھر یہاں کی تعلیم بھی کچھ میرے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔ یہاں اس کالج میں وہ سب کچھ ایف۔ایس۔سی میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، باٹنی، میتھی میٹک کے علاوہ زرعی حوالے سے ہل چلانا، گندم کاشت کرنا، اور پھر اس کے علاوہ کئی اور ایسے کام جو میرے مزاج کے مطابق نہیں تھے وہاں کرنے پڑے تو ہوش ٹھکانے پر آ گئی۔ لیکن اب مرتا کیا نہ کرتا کی مصداق اسی کالج میں پڑھنا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ پھر کالج کے اوقات بھی ایسے کہ جن کی پابندی میرے لیے انتہائی مشکل تھی۔ صبح سویرے سات بجے کالج شروع ہو جاتا تھا۔ بارہ بجے ایک گھنٹے کی تفریح جس میں گھر آ کر کچھ کھا لیتا اور پھر کالج چلا جاتا اور پھر تین بجے تک کلاس میں رہنا اور پچھلے پہر پھر ہاکی گراؤنڈ پر۔ جس دن سائیکل خراب ہو جاتی تو مسئلہ بن جاتا۔ کالج والوں سے جب بھی بات ہوتی تو اُن کا صرف ایک ہی جواب ہوتا کہ نیو ہاسٹل میں تمہیں کمرے کی چابی دے رکھی ہے وہیں رہو اور کھانا پینا تمہارا مفت ہے۔ پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے لیکن ہاسٹل میں میری طبیعت لگتی ہی نہ تھی۔ جب کبھی مضامین کے مشکل ہونے کی بات کرتا تو چودھری غلام رسول کا جواب ہوتا کہ تم میرے گھر پر آ جایا کرو میں تمہیں سائنس کے مضامین مفت میں پڑھا دوں گا۔ کچھ عرصہ میں نے ایسے بھی کیا لیکن زیادہ دیر تک یہ سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ بس صرف اُس وقت میری بوریت قدرے کم ہوتی جب میں گراؤنڈ پر ہاکی کھیل رہا ہوتا۔ مجھے اتنا شوق تھا کہ ہاکی پر میں ان تمام مشکلات کو برداشت کرتا رہا اور وقت گزرتا چلا گیا۔ لیکن میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ مجھے یہ کالج چھوڑنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ یہ لوگ تین سال تک تو میرے نخرے برداشت کریں اور جب میں ایف۔ایس۔سی میں فیل ہو جاؤں گا تو پھر میرا تعلیمی مستقبل تاریک ہو جائے گا اور میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔ کیونکہ یونیورسٹی کی سپورٹ بورڈ کا یہی قانون تھا کہ ایک لڑکا ایف۔ایس۔سی کے دوران صرف تین سال تک کھیل سکتا ہے۔

## کوئٹہ گورنمنٹ کالج سے میچ اور کوئٹہ روانگی (نومبر ۱۹۵۲)

انہی حالات میں یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ کا آغاز ہو گیا۔ اور ہمارا پہلا میچ گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے طے پا گیا۔ اُن دنوں پنجاب یونیورسٹی کی حدود کوئٹہ تک تھیں۔ اب میں نے ہاکی کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ تعلیمی سرگرمیوں میں پہلے ہی تسلسل نہ تھا۔ جبکہ ہاکی زور شور سے شروع ہو گئی۔ تو بوریت بھی قدرے کم ہوئی۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب ہم کوئٹہ کے لیے لائل پور سٹیشن سے رات کو ریل گاڑی کے ذریعے روانہ ہوئے یہ ایک لمبا سفر تھا۔ جو اس لحاظ سے تو بور تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ لیکن چونکہ ٹیم کے ہمراہ تھا اس لیے جب آپس میں بات چیت کی طرف متوجہ ہوتے تو ذرا دھیان بٹ جاتا۔ رات کے بعد صبح ہوئی دوسرا سارا دن بھی سفر میں ہی رہے اور پھر کہیں رات کو اللہ اللہ کر کے ہم کوئٹہ ریلوے سٹیشن پر

اُترے تو جان میں جان آئی۔ ''مچ'' ریلوے سٹیشن پر ریل گاڑی کے آگے دو انجن لگا دیے گئے پھر بھی گاڑی کی رفتار اتنی کم تھی کہ گاڑی سے اُتر کر ضروریات پوری کر کے بھی دوبارہ گاڑی پکڑی جا سکتی تھی۔ بہر حال کوئٹہ ریلوے سٹیشن پر گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے ہاکی انچارج اور زرعی کالج کے فارغ التحصیل لڑکے جو وہاں پر محکمہ زراعت میں نوکری کر رہے تھے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ سامان سٹیشن سے باہر لایا گیا اور ہمیں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ایک بڑے کمرے میں ٹھہرنے کے لیے جگہ دے دی گئی۔ ہماری ٹیم میں چودھری غلام رسول اور منظور باجوہ سینئر کھلاڑی تھی۔ جن کی شہرت بطور ہاکی کھلاڑی پورے ملک کے اندر ایک خاص مقام حاصل کر چکی تھی۔ اخبارات میں اُن کے کھیل کے بارے میں جو تاثرات بیان کیے جاتے تھے وہ اتنے حوصلہ افزا تھے کہ اُن کے بارے میں یہ خیال یقین کی صورت اختیار کر چکا تھا کہ وہ کسی دن ضرور پاکستان ہاکی ٹیم میں شامل ہو جائیں گے۔ باقی ہم چند لڑکے جونیئر بھی تھے جن میں خاص طور پر میں سب سے جونیئر تھا۔ حمید ہمارا گول کیپر، حافظ نذیر ہمارے لیفٹ ہاف، میری ہاکی میں پوزیشن رائٹ ہاف کی تھی جبکہ چودھری غلام رسول جو ہمارے کپتان بھی تھے سنٹر ہاف تھے۔ وہ ایم۔ ایس۔ ای کے اُس وقت طالب علم تھے۔ اور منظور باجوہ فل بیک بھی ایم۔ ایس۔ ای فائنل میں ہی تھے۔ ہم اپنے میچ سے دو تین روز پہلے ہی کوئٹہ پہنچ گئے تھے، کوئٹہ کے گراؤنڈوں سے مانوس ہونے کے لیے ایسا ضروری تھا کیونکہ کوئٹہ میں گراسی گراؤنڈ نہیں تھے۔ چٹیل میدان پر ہی کھیلنا پڑتا تھا۔

کوئٹہ شہر:

کوئٹہ انتہائی خوبصورت، صاف ستھرا اور ہر لحاظ سے حسین اور دلکش تھا۔ صرف ایک بار دیکھا جبکہ دوسری دفعہ دیکھنے کی حسرت آج تک پوری نہ ہو سکی۔ وسیع سڑکیں اور اچھے ہوٹل، سڑکوں کے کنارے خشک فروٹ کے درخت، سستا فروٹ اور سستی روٹی مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک روٹی ہم دو مل کر کھاتے تھے۔ چھوٹے گوشت کا قورمہ انتہائی لذیذ مگر سستا اتنا کہ ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ کوئٹہ کے باسیوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ سارے پاکستان کے صحت مند لوگ یہاں پر آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ نومبر کے مہینے میں ہمیں تو سخت سردی کا سامنا تھا لیکن ہمارے پٹھان دوست جو کہ زرعی کالج کے فارغ التحصیل تھے اور ہمہ وقت ہماری خدمت پر مامور تھے وہ ہمیں یہ کہتے کہ یہ تو کوئی سردی نہیں ہے، اللہ کرے کہ آپ لوگ سردی سے پہلے واپس چلے جائیں ورنہ ہماری ڈیوٹی میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ نومبر کے مہینے میں بھی وہاں کے غسل خانے اس قدر ٹھنڈے تھے کہ نہاتے ہوئے بے ہنگم آوازیں نکل جاتی تھیں۔

''یوحنا جھیل، یوحنا ویلی'' یہاں کے قابلِ دید مقامات تھے جو ہم نے میچ سے پہلے بھی دیکھے اور بعد میں بھی وہاں

گئے۔ بہرحال کوئٹہ شہر اپنی صفائی، کھلی سڑکوں، کشادہ اور اونچی عمارتوں والے ہوٹلوں اور صاف ستھری دکانوں کی وجہ سے بہت پسند آیا۔ البتہ رہائشی مکانات عموماً اس طرح کے نہیں تھے جیسے ہمارے ہاں کے ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ کوئٹہ کا وہ زلزلہ تھا جس نے پورے ہندوستان کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ بہرحال وہ دن بھی آ گیا جو ہمارے میچ کا دن تھا۔ گورنمنٹ کالج کا گراؤنڈ ایک چٹیل میدان کی شکل میں تھا جب ہم کھیلنے کے لیے اُترے تو دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ اس لیے کہ گورنمنٹ کالج لائل پور کی طرف سے الٹی میٹم مل چکا تھا اور اگر ہم یہاں سے جیت کر واپس جاتے تو اُن سے ہمارا دوسرا میچ تھا۔ ہم پر اس بات کا پریشر تھا کہ اگر ہم یہاں سے ہی نہ جیت سکے تو لائل پور میں تو ہماری بڑے بے عزتی ہوگی لہٰذا یہاں کا میچ لازماً جیتنا چاہیے۔

## ہاکی میچ:

ہمارا یہ میچ دیکھنے کے لیے کوئٹہ شہر کے اکثر لوگ گراؤنڈ پر موجد تھے، ایک طرف کرسیاں ہی کرسیاں تھیں۔ جن پر گورنمنٹ کالج کے اساتذہ، پرنسپل اور شہر کے معززین تشریف فرما تھے۔ اور ایک طرف گورنمنٹ کالج کے طالب علم اور طالبات تھیں، میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ اس وقت بھی اس کالج میں ''کو ایجوکیشن'' تھی اور لڑکیاں بھی بڑی ماڈرن تھیں ان لڑکیوں نے جب میچ شروع ہوا تو ہمیں سب سے زیادہ ''ہوٹ'' کیا۔ ہمارے خلاف بڑے زور وشور سے نعرہ بازی انہی لڑکیوں نے کی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ گاجر مولی کھانے والے پستہ بادام کھانے والوں سے مقابلے کے لیے آ گئے ہیں۔ ہمارے مددگاروں میں صرف ہمارے انچارج ڈاکٹر پروفیسر عبدالحفیظ اور وہ چند پٹھان بھی تھے، جن کا تعلق زرعی کالج سے رہا تھا اور جو وہاں سے گریجویشن کر کے یہیں کوئٹہ میں محکمہ زراعت میں ملازمت کر رہے تھے۔

میچ اُس وقت ہمارے لیے ایک بڑا مسئلہ بن گیا جب ہمارے خلاف ایک گول ہو گیا جس کو برابر کرنے کے لیے ہم انتہائی کوشش کرتے رہے۔ لیکن گول اُترنے کا نام ہی نہیں رہا تھا اور پریشر وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا، کئی دفعہ ہمیں شارٹ کارنر کا موقعہ بھی ملا۔ لیکن ناکامی ہی رہی۔ ہاف ٹائم کے بعد جب میچ دوبارہ شروع ہوا تو پھر ہم نے جدوجہد تیز سے تیز کر دی اور ہمیں ایک ''شارٹ کارنر'' کا موقعہ ملا۔ جس پر چودھری غلام رسول مرحوم نے گول کر کے میچ برابر کر دیا۔ ہماری جان میں جان آئی اور ہمارے حوصلے کو تقویت حاصل ہوئی تو پھر ہم نے یکے بعد دیگرے دو گول اور کر دیے اور جب میچ ختم ہوا تو ہمیں ہمارے مقامی ساتھیوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ اور پورے گراؤنڈ کا چکر لگایا۔ اس فتح پر ہماری خوشی اس لیے بھی تھی کہ اب ہم لائل پور فاتح کی حیثیت میں داخل ہوں گے اور گورنمنٹ کالج لائل پور کے ساتھ میچ کھیل سکیں گے۔ شام تک اس فتح کا جشن مناتے رہے۔ ہمارے میزبان پٹھان دوست ہم پر بڑے خوش تھے اُنہوں نے

ایک اچھے ہوٹل میں ہمیں کھانے کی دعوت دی اور یہ بھی کہا کہ انشاء اللہ کل ہم آپ کو زیارت کی سیر کے لیے لے کر چلیں گے۔ جس سے ہمیں انتہائی خوشی ہوئی کہ زیارت کو دیکھنے کا موقعہ ہمارے لیے ایک بڑی اچھی سیر تھی جس کا شوق ہمیں شروع سے ہی تھا۔ اور جس کا ذکر ہم اپنے پٹھان دوستوں سے کرتے بھی رہتے تھے۔

## زیارت کی زیارت کو:

دوسرے دن صبح کے ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم محکمہ زراعت کوئٹہ کی ایک وین پر اپنے پٹھان دوستوں کے ساتھ زیارت کے لیے روانہ ہو گئے جو کوئٹہ شہر سے تقریباً ستر میل کے فاصلہ پر تھا۔ ہمارے ان میزبان دوستوں نے بندوقیں بھی ساتھ رکھ لی تھیں کہ یہ ایک لازمی ہتھیار تھا جو وہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور یہ تو پھر سفر کا معاملہ بھی تھا۔ راستے میں ایک جگہ پر ہماری وین کو چند پٹھانوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا جو شاید کسی خوشی کی تقریب میں شرکت کے لیے ڈھول ڈھمکے کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں ناچتے ہوئے ہمارے پاس سے گزر رہے تھے۔ ہمارے پٹھان دوستوں نے ہمیں کہا کہ انہیں کچھ نہیں کہنا آرام سے بیٹھے رہیں لیکن وہ تو ہمارے گھیراؤ کو طول ہی دیتے جا رہے تھے اور ہم ان کی اس حرکت پر خوش ہونے کی بجائے پریشان تھے کہ نہ جانے یہ ہمارے ساتھ کیا کریں گے۔ آدھ گھنٹے تک جیسے ہم اُن کی حراست میں رہے جس کے بعد ہمیں آزادی مل گئی اور ہم اپنے سفر کو دوبارہ شروع کر سکے۔ ابھی کچھ دور ہی آگے گئے تھے کہ چودھری غلام رسول صاحب نے اچانک شور مچا دیا کہ ''بندوق دو، بندوق دو۔'' اُن کی اس آواز نے ہمیں اس خدشے میں مبتلا کر دیا کہ شاید کہیں سے ہم پر حملہ ہو گیا ہے۔ انتہائی پریشانی میں پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو پتہ چلا کہ چودھری غلام رسول نے کہیں دور ہرن دیکھ لیے ہیں اُن کے شکار کے لیے بندوق طلب کر رہے ہیں۔ دین رُکی تو چودھری صاحب بندوق لے کر ہرنوں پر حملہ آور ہوئے۔ اب ہرن آگے آگے اور چودھری صاحب اُن کے پیچھے۔ ہرن بہت دور جا کر رُک جاتے تو چودھری صاحب دوسرا فائر کر دیتے، پٹھان دوست چودھری صاحب کے اس شکار پر صرف ہنس رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ چودھری صاحب آپ ایسے ہی بے کار دیر کر رہے ہیں۔ شکار کرنا ہی ہے تو واپس کوئٹہ چلے جاتے ہیں کہ زیارت تو ابھی دور ہے۔ بڑی مشکل سے چودھری صاحب سے بندوق واپس لی اور ہم اپنے سفر کو روانہ ہوئے۔ کچھ دیر بعد ہم زیارت میں تھے۔ اور بانیٔ پاکستان کا وہ بنگلہ جس میں وہ آرام کرنے کے لیے آ جاتے تھے اور جہاں پر اُن کی زندگی کے آخری دن بسر ہوئے تھے ہمارے سامنے تھے۔ لکڑی کا یہ بنگلہ جس میں چند کمرے اور بڑی خوبصورت سیڑھیاں۔ پہاڑ کا دامن۔ اردگرد کا خوبصورت اور خوش نما فطری حسن یہ سب کچھ دل موہ لینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کچھ بے رونقی سی بھی محسوس کی کہ مری اور دوسرے صحت افزاء مقامات کی طرح رونق نہیں تھی بلکہ ایک خاص قسم کی اُداسی اور بے کیفی تھی جس

نے سارے ماحول اور علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اور مجھے خاص طور پر یہ بات کوئی اتنی اچھی نہیں لگی۔ ہم اُس لکڑی کے بنگلے میں جا بیٹھے اور دوپہر کا کھانا وہیں پر کھایا۔ اس بنگلے کے ایک ایک کونے کو دیکھا، پٹھان دوست ہمیں اس کے بارے میں جو اہم معلومات تھیں اس سے متعارف کراتے رہے اور پھر انہوں نے کہا کہ سنا ہے کہ بانیٔ پاکستان اس پہاڑ کے جس کے دامن میں یہ بنگلہ تھا اس پر سیر کے لیے بھی جاتے تھے۔ ہم بنگلے سے باہر آ کر کافی دیر تک اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتے رہے اور خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ چودھری صاحب نے کہا کہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر دیکھا جائے کہ اس پہاڑ کی دوسری طرف کیا ہے؟ کون سا علاقہ ہے اور کیسا ہے؟ ساری ٹیم کے لڑکوں نے اس بات کی تائید کر دی تو ہم اُن پٹھان دوستوں کی قیادت پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کو چڑھ دوڑے یہ پہاڑ عام پہاڑوں سے ذرا مختلف تھا۔ پہاڑ پر چڑھتے عموماً مشکل پیش آتی ہے لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی کہ چڑھائی چڑھتے ہوئے بھی محسوس یہ ہوتا تھا کہ کسی میدان میں ہی اوپر کی طرف چل رہے ایسی اونچائی نہیں تھی کہ مشکل پیدا کر دے۔ بڑے آرام سے ہم اوپر چڑھتے ہی چلے گئے۔ اور بڑی دیر کے بعد ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری جانب کا جائزہ لے رہے تھے۔ لیکن اسی دوران ٹیم کے اکثر لڑکے راستے ہی سے واپس چلے گئے تھے اور ہم چند دوست ہی جن میں چودھری غلام رسول صاحب ایک دو اور ساتھی چوٹی تک پہنچ پائے۔ جب ہم دوسری طرف دیکھ رہے تھے تو ایک میزبان پٹھان دوست نے ہمیں بتایا کہ یہاں سے اگر نیچے اتر کر جائے تو وہاں پر ایک ایسے اللہ والے کا مزار ہے کہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اُن کے مزار پر جو بھی دعا کی جائے وہ منظور و مقبول ہوتی ہے۔ چودھری صاحب نے فوراً کہا کہ نیچے اترنا چاہیے ہم نے اس کی تائید کر دی اور اُن پٹھان دوستوں کی قیادت میں پہاڑ کی دوسری جانب نیچے اترنا کا مشکل کام شروع کر دیا۔ اب ہم قدم قدم پر دیکھ بھال کے اُتر رہے تھے اور ہمیں جلدی احساس ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ پہاڑ چڑھتے ہوئے تو ہمیں کوئی مشکل پیش نہ آئی لیکن اُترتے ہوئے خاصی دقت ہو رہی تھی احتیاط بھی زیادہ کرنی پڑی۔ لیکن عزم جوان تھا کہ ہم آہستہ آہستہ نیچے کی طرف اترتے چلے گئے راستے میں ایک دو جگہوں پر ہم نے دیکھا کہ پہاڑ سے صاف پانی نکل رہا ہے ہم نے منہ لگا کر وہ پانی بھی پیا اور بالآخر ہم نیچے اتر کر اس بزرگ کی قبر پر پہنچ ہی گئے۔ ایک بڑے کمرے میں کوئی پانچ چھے گز سے بھی زیادہ لمبی قبر جس کے سر کی طرف ایک مٹی کا برتن تھا جس میں راکھ رکھی ہوئی تھی۔ پٹھان دوستوں نے بتایا یہ راکھ ہر مرض کے علاج کے لیے لوگ لے جاتے ہیں اور شفا ہو جاتی ہم سب نے وہاں پر دعا مانگی ایک دعا میں نے بھی مانگی جو بعد میں پوری ہوئی۔ اب واپسی کا پروگرام تھا پھر پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا اور دوبارہ جب ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو رات کی تاریکی نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور نیچے سے ہمیں آوازیں دی جا رہی تھیں کہ جلد واپس آؤ دیر ہو گئی ہے۔ نیچے سے اوپر کی طرف آتی ہوئی آواز

ماحول میں ایک عجیب وغریب قسم کا تاثر پیدا کر رہی تھی، ایک گونج جو رک رک کر اوپر کی طرف آتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آوازیں دے رہے تھے اور ہم اُن کی آواز کی گونج سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ اب واپسی دوڑ کر ہی ممکن ہے، چنانچہ ہم نے اوپر کی طرف سے نیچے دوڑنا شروع کیا تو بہت جلد ہم بانی پاکستان کے بنگلہ تک پہنچے ہمارے انچارج پروفیسر ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب بہت ناراض ہوئے۔ اور کہا کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو ذمہ داری تو میری تھی بڑی مشکل سے اُنہیں راضی کیا اور معافی مانگی پھر ہم رات کی تاریکی میں واپس کوئٹہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ چودھری غلام رسول نے کہا کہ آنکھیں بند کر کے اللہ اللہ کرتے چلو۔ زندگی ہوئی تو خیریت سے پہنچ جائیں گے۔ رات کافی دیر کو ہم واپس کوئٹہ آئے تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ بہرحال زیارت دیکھنے کا شوق پورا ہو گیا۔ کوئٹہ سے دوسرے دن واپس روانہ ہو کے ہم بخیریت لائل پور آ گئے۔

ہمیں آج بھی اُن پٹھان دوستوں کی خدمت یاد ہے جنھوں نے ہمارے لیے وہاں بہت کچھ کیا ہمہ وقت ہمارا خیال رکھا اور ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ صبح ہوتے ہی ہر کھلاڑی کی تمام جیبیں وہ خشک میوہ جات سے بھر دیتے تھے جو ہم سارا دن کھاتے رہتے۔ اُن کے خلوص اور محبت کو شاید بعد کوشش بھی فراموش نہ کر پائیں گے اللہ تعالیٰ اُنہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ (جاری ہے)